مولانا الطاف الرحمان بنوی

بابل کا نمرود

نمرود کی نسبی، حسبی اور تاریخی حیثیت کا جائزہ

آج سے ہزاروں سال[1] پہلے بابل (موجودہ عراق) دنیا کی اس عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت تھا جس کی سطوت و شوکت کی ہر طرف دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ نظم مملکت کی بھاگ ڈور — تاریخ انسانی کے انتہائی متکبر و جبّار — نمرود نامی ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں میں تھی جس نے اس وقت کے بابلی مذہب — کوکب پرستی کے سب سے بڑے الٰہ — آفتاب — کی مظہریت اور زمینی نیابت کے پردے میں خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور رعیت کو اپنے مزعومہ آستانۂ جلال پر سجدہ کرنے کا حکم مؤرخین بالعموم چار آدمیوں کو "ملوک الدنیا" کے نام سے یاد کرتے ہیں جن میں نمرود سرفہرست ہے۔ نمرود کون تھا؟ اس سوال کے جواب میں متعدد اقوال منقول ہیں۔ کسی نے اس کو نمرود بن فالح بن عابر بن صالح بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام بتایا ہے۔ اس کے علاوہ نمرود نا نوح علیہ السلام کے نسبی عمود کو اور بھی کئی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] قرون اولیٰ کی کسی بھی شخصیت یا واقعہ کے زمانے کی صحیح اور قطعی تعیین دشوار ہی نہیں بلکہ قریباً قریباً ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں توریت، تاریخ یا آثارِ قدیمہ کے مطالعہ سے جو بھی نتیجہ اخذ کیا جاتے۔ وہ کسی طور بھی حرف آخر کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ موجودہ توریت سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ خدا تعالیٰ کی کتاب نہیں بلکہ اسرائیلی زائغین و محرفین کا مرتب کردہ وہ مشتبہ مجموعہ ہے جس میں خدائی متن اور انسانی شرح کا کوئی امتیاز نہیں بے شمار نقلی اور خارجی شواہد کے علاوہ اس کی عبادات اور مندرجات ہی میں بیسیوں وہ عقلی اور داخلی قرائن موجود ہیں۔ جو نہ صرف اس کی لاہوتی حیثیت کو چیلنج کرتی ہیں۔ بلکہ ساتھ ساتھ اس حقیقت کی غمازی بھی کرتی ہیں۔ کہ وہ کوئی یقین آفرین صحیفۂ آسمانی نہیں بلکہ پایۂ اعتبار سے ساقط ظن و تخمین کا پلندہ ہے۔

توریت کے بعد ان تاریخی دفاتر کا نمبر آتا ہے جن کا ماخذ توریت ہی یا اس سے بھی زیادہ غیر مستند وہ زبانی روایات ہوتی ہیں۔ جو سالہا سال تک ان غیر ذمہ دار لوگوں کی قصہ گوئیوں اور داستان سرائیوں کا حصہ رہ چکی ہوتی ہیں

جو نقل حکایت میں کسی قسم کا احتیاط برتنے کی کوئی پابندی محسوس نہیں کرتے۔ اندریں حالات صحیح سے صحیح تر واقعہ بھی اس تاریک دور سے سلامتی کے ساتھ گزر آنے کی کوئی ضمانت فراہم نہیں کرتا۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں ماضی کے دریچوں میں جھانکنے اور تاریخی تحقیقات کے لئے آثار قدیمہ کے فنی جائزوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ طرز تحقیق انسانی علوم میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ نیز کسی واقعہ کے نفس وجود و عدم کی بابت اس کا فیصلہ ظنِ غالب پیدا کرنے میں مفید بھی۔ لیکن اوقات و ازمنہ کی تعیین میں اس کی راہنمائی پر کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مانا کہ انسانی کاوشوں نے بہت سے مستبعداتِ عقلیہ کو روزمرہ کے عمومی معمولات کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور مستحیل العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں لیکن اجسام طبیعہ کو متاثر کرنے والے لامتناہی عوامل اور ان کی اثر اندازی کی ٹھیک ٹھیک رفتار و مقدار معلوم کرنے کے لئے تاہنوز کوئی ایسا معمل تیار نہیں ہو سکا ہے جو یقین تو کیا اس سے کم درجہ کے معتد بہ اطمینان پیدا کر سکے۔

لاتعداد تفصیلی امثلہ کو چھوڑیئے۔ مذکورہ بالا بیان کی توثیق کے لئے ایک ہی مثال پیشِ خدمت ہے جس سے ناواقف قارئین کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانۂ پیدائش کی تعیین میں توریت اور اکثر کتب تواریخ یک زبان نہیں۔ تاہم ان کے الگ الگ بیانات میں ناقابل تطبیق اختلافات کے باوجود یہ قدر مشترک فرض کیا جاسکتا ہے۔ کہ یہ بضع الوف (تین سے نو ہزار) سال پہلے کا واقعہ ہے لیکن تاریخ ہی کی بعض دوسری کتابوں یا آثار کہنہ کی شہادت اس کو اس سے بہت ہی پہلے کا واقعہ قرار دیتی ہے۔

علامہ عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب "الیواقیت والجواہر" میں شیخ ابن العربی مالکیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بعض قدیم تاریخوں میں مذکور ہے کہ اہرام مصر کی تعمیر اس وقت ہوئی جب کہ "نسر" برج اسد اور ایک نسخے کے مطابق برج حمل میں تھا جب کہ ابھی جدی میں ہے۔ شیخ عبدالکریم بن شیخ اکبر کے اس کلام کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ بات معلوم ہے کہ "نسر" کسی ایک برج سے دوسرے برج کی طرف تیس ہزار سال میں منتقل ہوتا ہے۔ علامہ جبلی کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں دلو میں ہے۔ اس حساب سے "نسر" تعمیر اہرام سے لے کر اب تک دس برج قطع کئے ہیں جس میں کوئی تین لاکھ سال صرف ہوئے ہیں۔

اہرام مصر آج بھی فنِ تعمیر کا شاہکار نمونہ تصور کئے جاتے ہیں۔ اور دنیا کے عجائبات میں محسوب ہیں۔ ان کی تعمیر انسانی دور اولین میں نہیں بلکہ یقیناً اسی وقت ہوئی ہوگی جب کہ اس نے تہذیب و تمدن اور تعمیر و ترقی کے سینکڑوں مراحل طے کئے ہوں گے۔ تین لاکھ سال میں ان ارتقائی مراحل میں صرف ہونے والی تخمینی مدت کا اضافہ کیجئے یہی آغاز انسانیت ــــ پیدائش آدم علیہ السلام ــ کا زمانہ قرار پائے گا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ کہ

"ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ ضحاک بن علوان ہی نمرود تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی کے زمانے میں پیدا ہوئے اور یہی تھا جس نے اُس کے جلانے کا قصد کیا تھا"

لیکن ابن اثیر نے اس قول کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نمرود نبطی نسب اور ضحاک فارسی النسل ہیں پھر دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔

ابن اثیر "الکامل" میں نمرود کو مستقل حکمران نہیں بلکہ ضحاک بن علوان کا عامل بتلاتا ہے۔ لیکن قرآنی ارشاد "ان اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ" میں لفظ "الملک" اور اس کا انداز استعمال ان کی اس رائے کی کھلی تغلیط کرتا ہے۔ قرآن مجید کی تصریح ہے کہ اس نے ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم السلام کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ذات و وجود میں محض اس بنا پر مناظرہ کیا کہ رب تعالیٰ نے اس کو قدرت و حکومت عطا کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقتدار و اختیار کے اس بلند مقام پر فائز تھا جس کے ہوتے ہوئے اس کو کسی دوسرے کی برتری کا اقرار تو کیا — احساس تک نہیں ہو سکتا تھا۔ اصل بادشاہ اور صاحب اقتدار و اختیار کوئی اور ہو تو عامل کی طرف سے "اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ" جیسی مطلق العنانی اور غیر معلق و مشروط تصرف کا دعویٰ بعید از قیاس ہے

"ملوک الدنیا" کے لقب سے معروف ان چار حکمرانوں یعنی نمرود۔ ذوالقرنین۔ بخت نصر اور حضرت سلیمان علیہ السلام میں سے اول الذکر کی بابت زیادہ سے زیادہ — کہ اس کا زمانہ سب سے قدیم تر ہے — اور آخر الذکر کے بارے میں کم سے کم — کہ اس کو تسخیر کائنات کی غیر معمولی قوتیں حاصل تھیں — یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ ازمنہ

بقیہ ص ابن العربی کی محولہ تاریخ نے بنائے اہرام اور "نسر" کے اسد یا حمل میں ہونے کا یہ تعلق کہاں سے معلوم کیا اس میں عقلی احتمالات تو بے شمار ہو سکتے ہیں تاہم اصولی طور پر ان کی تحدید یوں ممکن ہے۔ کہ یا تو اہرام کی براہ راست اپنی تاریخ محفوظ ہو یا کسی غیر مسلسل منقطع سلسلۂ نقل سے ماخوذ یا اثریات سے مستفاد ہو۔ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ پہلی صورت غیر واقع ہے۔ لہٰذا دوسری یا تیسری صورت متعین ہے۔ اب تخلیق آدم علیہ السلام کے زمانہ کی تعیین میں توریت اور اس کے قریب الخیال تواریخ و آثار کی بات مان لی جائے۔ یا قریب قریب اسی پایہ کی دوسری تاریخوں اور جدید ترین اثریات جو عمر انبیات کی مدد سے انسانی تاریخ کی کہنگی کا پتہ چلاتی ہیں پر بھروسہ کیا جائے اور جو بھی صورت اختیار کی جائے اس کی کوئی معقول وجہ ترجیح کیا ہوگی۔ نمرودی دورِ حکومت اور اس کے زمانہ عروج کی تعیین میں تینوں علمی ذرائع — توریت اور تواریخ و اثریات — متفق الخیال نہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے کسی متعین عدد کی بجائے "ہزاروں سال" کا مبہم انداز اختیار کیا جو عُرفاً قدامت کے ہر درجہ کے لئے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔

ماضیہ کے اُن قدیم ادوار میں جب کہ انسانیت — فی الوقت بڑی عمدہ اور ترقی یافتہ ہی سہی — نسبتاً ایک نہایت ہی تنگ و تاریک تمدن سے گزر رہی تھی۔ کیا عقلی طور پر یہ ممکن بھی ہے کہ ساری دنیا ایک وحدت میں سموئی ہوئی ہو جس کا مرکز دوسرے تمام اعضائے مملکت پر پوری طرح حاوی اور مسلّط ہو۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں کے سوا مواصلات اور نقل و حمل کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نمرود مذہبی پیشوائی اور سیاسی فرماں روائی دونوں کا جامع تھا۔ اس دوہری حیثیت سے جہاں اس کی ذمہ داریاں اس حد تک بڑھتی ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے اس وقت کے مروجہ وسائل قطعاً ناکافی تھے۔ وہاں اس کی ذات کی اس بے سروسامانی کے باوجود یہ ہمہ جہتی مرکزیت اس خدشے کو بھی جنم دیتی ہے کہ چار دانگ عالم کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی دور دراز کی ساری آبادیاں — انسان کے فطری جذبۂ آزادی و حریت کے باوصف اس کے جابرانہ کنٹرول میں کیونکر ایسی جکڑی ہوئی تھیں کہ اس کے دورِ حکومت کے طول طویل زمانے میں کسی کو بھی اس مغرور مقتدر سے سرتابی کی جرأت نہ ہوئی۔

یہی وہ عقلی پیچیدگی اور الجھن ہے جس کی وجہ سے ملوک الدنیا کی اس تاریخی روایت کو حقیقت کی بجائے ایک مفروضہ سمجھا جا رہا ہے۔ اور بلاشبہ اپنے ظاہری معنی میں مفروضہ ہی ہے تاہم اس کی تصحیح کی کوششوں میں کئی توجیہات کی گئی ہیں۔ مثلاً پہلی توجیہہ وہ کہ جس میں عمرانیات کی مدد سے لفظ دنیا کو — اس وسیع مفہوم میں جو آج کل اصطلاح میں متبادر ہے کاٹ کر — ایک ایسے معنی پر حمل کیا گیا ہے جس سے یہ استبعاد خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ابھی ہی طوفانِ نوح علیہ السلام کی ہولناکیاں تمام انسانی بستیوں کو نابود کر چکی تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ہمراہ کشتی میں سوار بمشکل کئی نفوس زندہ بچ رہے تھے جو یقیناً ایک لمبے عرصے تک عذاب کی دہشت اور ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات میں تنہائی کی وحشت سے بیخود اور سراسیمہ ہوتے ہوں گے۔ نسل انسانی کا باقاعدہ تسلسل جاری ہو جانے میں خدا معلوم کتنا عرصہ لگ ہو چکا ہو گا اور پھر اس کی شرح افزائش کیا ہو گی۔ ابن خلدون نے "کتاب البدر" کے حوالے سے نمرود کو نوح علیہ السلام کے بعد پانچویں پشت میں قرار دیا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں نسل انسانی اور اس کی آبادیاں جس کی حد تک بڑھنے اور پھیلنے کا امکان ہے اسی کا تصور نمرود کے "ملک الدنیا" ہونے کا ایک قابلِ قبول نقشہ متعین کرتا ہے۔

یہ توجیہہ بظاہر اشکال کو حل کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن دو وجہ سے مخدوش قرار پاتی ہے۔ اولاً یہ کہ اس میں نمرودی کی عالمی حکمرانی کو ممکن الوقوع بنانے کے لئے تقلیل و تضییق معمورہ کی جو سعی کی گئی ہے وہ جبھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب کہ طوفان نوح علیہ السلام کو عام مان لیا جائے۔ حالاں کہ اس کی عمومیت

مشکوک اور غیر قطعی ہے۔ ثانیاً یہ کہ جن تاریخوں نے نمرود کو ملک الدنیا ہونے کا اعزاز بخشا ہے انہیں کی بعض دوسری روایات اسی کے ہم عصر کئی ایسے دوسرے بادشاہوں کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ جن کے اس کے زیر اقتدار اور تختا بحکم ہونے کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔

نمرود کے ملک الدنیا ہونے کی دوسری اور بالکل بے غبار توجیہہ یوں ممکن ہے۔ کہ اگرچہ دنیا کے مختلف خطوں اور نسلوں میں اس کی معاصر اور بھی حکومتیں موجود تھیں جو اس کی باجگذار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار تھیں لیکن وہ سب بابل کی مضبوط، محکم اور منظم نمرودی حکومت کے مقابلے میں ہیچ اور کالعدم تھیں۔ گویا کہ اقوی میں منحصر مانا گیا۔

غرض کسی بھی طور ملک الدنیا کا اطلاق مجاز سے خالی نہیں۔ پہلی توجیہہ لفظ "دنیا"[1] اور دوسری لفظ "ملک" میں تصرف پر مبنی ہے۔

بہرحال سبھی اور تاریخی لحاظ سے نمرود کوئی اور کچھ بھی تھا جسبی لحاظ سے فساد آدمیت کا بدترین نمونہ پیش کر رہا تھا۔ وہ حدود عبودیت سے نکل نکل کر معبودیت کے حدود میں دخل اندازیاں کر رہا تھا۔ اور کسی کی محکومیت کی بجائے ہر جگہ اپنی حاکمیت مطلقہ کے جھنڈے گاڑھ رہا تھا۔ مادی وسائل کی بہتات، اسباب تعیش کی فراوانی اور عسکری قہر و قوت کی برتری نے اس کی حیوانی خصلتوں میں اشتعال و انگیخت پیدا کر دیا تھا جس کی تپش و حرارت نے اس کے فہم و شعور اور تمام انسانی ملکات کو مجسم کر ڈالا تھا۔

[1] اہل علم کی تسلی و تشفی کے لئے واضح ہو کہ اس توجیہہ میں لفظ دنیا کا تجوز "رعایت معنی عند التکلم" کے مطابق ہے۔ نہیں تو حالت اعتبار الحکم کے لحاظ سے حقیقت بنے گی۔ علاوہ ازیں اس لفظ میں اس مجاز سے پہلے ایک اور مجاز بھی موجود ہے۔ جو کثرت وقوع کی وجہ سے حقیقت کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ فنون ادبیہ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین خود ہی سوچ لیں۔